فصل اوّل

نیو ورلڈ آرڈر

انسان جب تک الٰہی ہدایتوں کا پیروکار اور معتقد رہتا ہے اس وقت تک اس میں انانیت پرستی اور اپنی بڑائی کے مقابلے میں دوسروں کو چھوٹا سمجھنے کا رجحان نہیں ہوتا، مگر جوں جوں روحانی پہلو کمزور ہوتا جاتا ہے، ہدایت الٰہی سے تعلق میں کمی آتی ہے اور دنیا طلبی میں اضافہ ہوتا ہے تو اس میں انانیت پرستی کے ساتھ ساتھ اپنے کو بڑا سمجھنے اور دوسروں کو چھوٹا سمجھ کر دبانے اور اپنا تابع بنانے کا رجحان پیدا ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کوئی شخص یا کوئی نظام خدائی تک کا دعویٰ کر بیٹھتا ہے۔ آج کا امریکہ اپنے آپ کو اسی مقام پر فائز قرار دیتا اور دلواتا ہے۔ اسی چیز کو پہلے نیو ورلڈ آرڈر کا عنوان دیا گیا اور اب اسے گلوبلائزیشن یا عالمگیریت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

نیو ورلڈ آرڈر یا گلوبلائزیشن کیا ہے؟

گلوبلائزیشن دراصل طاقتور قوموں کا پسماندہ قوموں کے وسائل پر قبضہ کرنے کی ایک چال ہے۔ تیل کی دولت اور ان کے دیگر وسائل پر قبضہ کرنے کی شاطرانہ حکمت عملی کے ساتھ اپنی تہذیب کو رائج کرنا بنیادی مقصود ہے۔

امریکا، اس کے جاپانی اور یورپی اتحادی تیسری دنیا پر ایک نیا معاشی و سیاسی نظام مسلط کرنا چاہتے ہیں اور اس کے نفاذ کے لیے غریب ملکوں پر جس نسخہ کے استعمال کے لیے شدید دباؤ ڈال رہے ہیں اس سے ان ملکوں کی بیماریوں میں اضافہ ہی ہوگا۔ نئے نظام کے معاشی پروگرام کے اہم نکات میں تجارت کے راستے میں حائل کسٹم ڈیوٹی کم کرانا، ریاستی امداد (سبسڈی) ختم کرنا، آزاد منڈی کا راج قائم کرنا، پیداوار اور تقسیم پر ریاستی کنٹرول ختم کرنا اور نجکاری کرنا ہے۔ سیاسی معاہدہ منتخب حکومت کو خریدنے، بڑی رقموں کے ذریعے زیر کرنے اور اپنے مطلب کے، درمیانی طبقے کی حمایت حاصل کرنے پر مشتمل ہے۔

نیا عالمی نظام کئی پہلوؤں سے دوسو سال پرانے برطانوی سامراج کے مسلط کردہ نظام سے ملتا جلتا ہے۔ نوم چومسکی نے اپنی کتاب Profit Over People میں اس بدنامِ زمانہ جارحیت کے ایک پہلو کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے، جو ہمیں برطانوی سامراج کی طرف سے برصغیر کے امیر ترین علاقوں پر دوامی بندوبست مسلط کرنے کی یاد دلاتا ہے۔ چالیس سال بعد ایک سرکاری کمیشن نے نتیجہ اخذ کیا کہ 'دوامی بندوبست' کا منصوبہ بڑی احتیاط اور غور وخوض کے بعد تیار کیا گیا تھا جو غریب طبقوں پر شدید ظلم پر منتج ہوا اور اس نے ایسی بدحالی پیدا کی کہ جس کی مثال کامرس کی تاریخ میں تلاش کرنا مشکل ہے۔ تاہم برطانوی گورنر جنرل نے مختلف نتیجہ اخذ کیا۔ اس نے اپنے نوٹس میں لکھا:

> ''دوامی بندوبست کئی لحاظ سے اور انتہائی اہم ضروریات کے حوالے سے ناکام تھا، پھر بھی کم از کم اس کی عظیم اہمیت یہ تھی کہ اس سے امیر زمینداروں کا ایسا وسیع طبقہ پیدا ہوا جو برطانوی راج جاری رکھنے کی شدید خواہش رکھتا تھا اور عوام پر اس کا مکمل کنٹرول تھا۔''[۱]

۱۔ مبشر حسن، گلوبلائزیشن کیا ہے، ص ۱۳۳، اسلام آباد

عصرِ حاضر کا سامراجی حملہ وسعت میں اس سے کم نہیں۔ آج پھر دنیا کی بڑی صنعتی اور مالیاتی قوتیں تیسری دنیا میں صنعت، مالیات اور تجارت کے حوالے سے امیرترین طبقہ پیدا کر رہی ہیں' جو اپنے ہاں نئے سیاسی و معاشی نظام کے قیام کے لیے ان کے ایجنٹ کا م کرے۔ تیسری دنیا کے انتہائی مالداروں، سیاست دانوں، حکومتوں اور قومی ذرائع ابلاغ کو خریدنے اور انھیں متاثر کرنے کے لیے بڑی رقوم مختص ہیں۔

نجکاری، غیرمنصوبہ بند معیشت اور عالم گیریت کے حملہ کے آگے جھکنے کا مطلب معاشی اور سماجی ناہمواری کو پروان چڑھانا، معاشرے میں غریب طبقوں کی محرومیوں میں غیرمعمولی اضافہ، ماحول پر تباہ کن اثرات، غیر مستحکم قومی معیشت، غیرجمہوری رجحانات اور مال داروں کی دولت میں مزید اور بے مثال اضافہ ہے۔ کوئی ملک اس سے نہیں بچا۔ پاکستان میں ۸۰ء کی دہائی کے شروع میں نج کاری، ڈی ریگولیشن اور عالم گیریت نے فروغ پانا شروع کیا۔ بعد میں آنے والی حکومتوں نے اس عمل کو تیز کیا۔ وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے انتہائی لاپرواہی اور تن آسانی سے WTO (عالمی تجارتی تنظیم) کے ساتھ معاہدے پر دستخط کر دیے اور اس کی ہدایات پر عمل درآمد شروع کرنے اور کھائی میں لڑھکنے کے لیے ضرورت سے زیادہ تیزی دکھائی۔

وزیراعظم نواز شریف نے پاکستانی روپے کو ڈالر میں بدلنے کے لیے فری کر دیا اور نصف صدی میں بننے والی عوامی اثاثوں کو کوڑیوں کے بھاؤ بیچنا شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ معاشی و سیاسی تباہی تھا۔

مجموعی قومی پیداوار کی شرح ترقی (Growth Rate - GDP) اور دولت پیدا کرنے والے ادارے، دونوں حوالوں سے اس قدر معاشی جمود پیدا ہوا کہ غربت میں اضافے کی شرح کا ریکارڈ قائم ہوگیا۔ اگر ہم غذائیت میں ۲۵۰۰ حرارے (Calories) کا معیار قائم کریں تو ۱۹۸۷ء میں ۱۷ فی صد آبادی اس ضرورت سے محروم تھی۔ جب کہ اب ۳۰ فی صد سے زیادہ آبادی اس بنیادی ضرورت سے محروم ہوچکی ہے۔ آج ایک تہائی آبادی ضروری غذا سے محروم ہے۔ ۱۹۸۰ء تک ڈالر کی قیمت دس روپے سے کم تھی جو ۲۰۰۷ء میں ۶۰ روپے اور ۲۰۰۹ء میں ۸۰ روپے سے زیادہ ہوچکی ہے۔

افراطِ زر اور بے روزگاری کے دوہرے بھوت نے اپنا سر اُٹھایا۔ حکومت بری طرح مجروح ہوئی کیونکہ ریاست کی قوت اور حکومت کرنے کی صلاحیت میں شدید کمی واقع ہوئی۔ ریاست اور معاشرے کی طرف سے جرائم میں خوفناک اضافہ ہوا۔ قانون کی حکمرانی کمزور ہوئی۔

نتیجہ کیا نکلا؟ بے روزگاری کے ہجوم، گلیوں میں بھکاری، کچرے کے ڈرموں سے چیتھڑے اور گلی سڑی خوراک کے ٹکڑے ڈھونڈتے ہوئے بوڑھے لوگ۔ تیسری دنیا میں ترقی کے نام پر صنعت کے لیے ریاستی سرپرستی ختم کرنا ایسے ہی غلط ہے جس طرح ڈی ریگولیشن اور عالمگیریت کا فارمولا غلط ہے۔[۲]

نیو ورلڈ آرڈر کے مقاصد

☆ تمام دنیا پر امریکا کی بالادستی اور اُن کی تہذیب و ثقافت کا پرچار نیو ورلڈ آرڈر کا اولین مقصد ہے۔ اس کے لیے انھوں نے یہ منصوبہ بنایا ہے کہ مسلم قیادتوں میں شکوک وشبہات پیدا کر کے ان کے درمیان اختلافات کی خلیج کو

---

۲ Paterick J. Buchanen, A Republic, Not An empire, P, Introduction, xiv

وسیع تر کرکے اِن کو آپس میں ہی اُلجھا دیا جائے تاکہ وہ کوئی تعمیری کام نہ کرسکیں اور استعماری قوتوں کے بالمقابل کھڑے ہونے کی ہمت اور قوت پیدا نہ کرسکیں۔

☆ نوجوانوں کی سرگرمیوں کو کنٹرول کرنے کے لیے اِن کی قوتوں کو صرف مذہبی رسوم وعبادات میں کھپایا جائے۔ اِس سلسلے میں ایسی مذہبی قیادتوں کو پروان چڑھانے میں مدد دی جائے جو کہ سیاست سے تعرض نہیں کرتیں اور صرف عبادت پر زور دیتی ہیں۔

☆ مذہبی فروعی اختلافات کو وسیع کر دیا جائے اور نوجوانوں کے ذہنوں میں اِسے نمایاں کیا جائے۔

☆ سنت اور دوسرے اسلامی ماخذوں کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کیے جائیں۔

☆ نوجوان نسل میں اسلامی تعلیمات کی طرف دلچسپی بڑھ رہی ہے۔ اِس کا تدارک کیا جائے۔ داڑھی، حجاب اور دیگر اسلامی شعائر کو معاشرے میں دقیانوسی کی علامات قرار دینے کے لیے جدوجہد کی جائے۔

معروف امریکی دانشور پیٹرک جے بکانن نے اپنی کتاب ''استعمار نہیں جمہوری ملک'' کے پیش لفظ میں تحریر کیا ہے:

''امریکہ کو بالادست قوت بنادینے کی پالیسی پاکس امریکا نا Pax Americana اور اسے بالا تر عالمگیر معیشت کا نسخہ ''مستقل امن کے لئے مستقل جنگ'' کی صورت حال پیدا کردے گا۔ امریکیوں کو خود جائزہ لینا چاہیے کہ ان کے نام پر کیا خارجہ پالیسی تبدیل کی جا رہی ہے۔ 1990ء میں خلیج میں جنگ شروع کرنے کا اس کے علاوہ کیا فلسفہ تھا کہ ہم دکھا دینا چاہتے ہیں کہ ہم سپر پاور ہیں۔''[۳]

جیفرسن نے کہا تھا:

''امن، تجارت اور دوستی'' امریکی پالیسی ہونی چاہیے اور ہمیں کسی الائنس کا حصہ نہیں بننا چاہیے۔''[۴]

جان کوئنسی ایڈمز نے کہا تھا:

''امریکہ کا یہ کام نہیں ہے کہ خونخوار (Mansters) کو ڈھونڈے اور انہیں تباہ کرے۔''[۵]

نیو ورلڈ آرڈر کے قیام کے لیے منصوبہ بندی

نئے عالمی نظام کے قیام سے پہلے اس کی زبردست منصوبہ بندی کی گئی۔ صہیونی پروگراموں میں اس کا تخیل پیش کیا گیا۔ پھر اس کی تنقید کے وسائل و ذرائع متعین کیے گئے۔ آخر میں امریکا جیسے مادی دولت سے مالا مال ملک کو تجربہ گاہ بنا کر استعماری قوتوں نے متحد ہو کر اس نقشہ میں رنگ بھرنا شروع کر دیا۔ اس بنیادی مقصد اور نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے زمانے کے تقاضوں، بدلتے ہوئے سیاسی و اقتصادی ماحول اور وقت کی نبض کو پہچانتے ہوئے وسائل و ذرائع اور طریقۂ کار میں جزوی تبدیلیاں کی جاتی ہیں۔

خلیجی جنگ میں بظاہر کامیابیوں سے استعماری طاقتوں کو موقع مل گیا اور انھوں نے سرد جنگ میں روس کی شکست کے بعد دنیا پر حکمرانی کا خواب دیکھنا شروع کر دیا۔ سینیر بش نے اس عالمی نظام کا ایک خاکہ پیش کیا۔

---

۳ Paterick J. Buchanen, A Republic, Not An empire, P, Introduction, xix

۴ Ibid

۵ Ibid

حقیقت یہ ہے کہ امریکی اپنی مملکت کے قیام کے وقت سے اپنے آپ کو اِس قائدانہ دور کے لیے تیار کررہے تھے۔ چنانچہ اولین امریکی صدر جارج واشنگٹن نے ۱۷۸۹ء کے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا تھا کہ ''امریکی قوم کو اللہ کے سپرد کردہ مشن کا میں ذمہ دار ہوں۔'' ایک اور امریکی صدر تھامس جیفرسن نے اِس مہم کو ''اللہ کی پسندیدہ قوم کا مشن قرار دیا۔'' صدر آئزن ہاور نے ۱۹۵۳ء کی ایک سیاسی تقریر میں کہا: ''ہمارے عصر کے چیلنجوں کے مقابلہ کے لیے تقدیر نے ہمارے ملک کو آزاد دنیا کی قیادت عطا کی ہے''۔ جنگِ عظیم دوم کے خاتمہ پر امریکی صدر روز ویلٹ نے کہا: ''اب دنیا کو امریکی بنانا ضروری ہے۔'' اور اسی 'مقدس مشن' کی تکمیل کے لیے نئی صدی کی ابتداء میں بش جونیئر پنجے اُکھاڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔[۶]

نئے عالمی نظام کی تاسیس میں اقوامِ متحدہ کا کردار

اقوامِ متحدہ کا ادارہ ایک طرح سے عالمی نظامِ حکومت کے قیام میں خشتِ اوّل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں چند اقوال پیش ہیں:

''سلامتی کونسل ایک بین الاقوامی فوج ہو۔''[۷]

☆ ''عنقریب جس نئے عالمی نظام کی تشکیل ہوگی، اقوامِ متحدہ اس کا اوّلین رمز ہے۔''[۸]

☆ ''ایسے ممالک جن پر اقوامِ متحدہ اپنی تمام تر صلاحیتوں اور بھرپور توانائیوں کے ساتھ حاوی ہے، ان پر حکمرانی کے لیے اقوامِ متحدہ کے ذریعہ ذیلی اداروں کی تشکیل کی جائے گی۔ اقوامِ متحدہ کے زیرِ اہتمام بین الاقوامی عسکری قوت کی تشکیل ہوگی، تاکہ اس ادارہ کو فوجی صلاحیت بھی حاصل ہوجائے اور وہ اپنی مرضی دوسرے ملکوں پر مسلط کرسکے۔ اس مقصد کے لیے اقوامِ متحدہ کے چارٹر میں معمولی ترمیم اور تبدیلی کرنی ہوگی۔ اس طرح ایک عالمی حکومت کی تشکیل ہوجائے گی۔ ہماری مراد نئے عالمی نظام سے ہے جس کی تشکیل ہم چاہتے ہیں۔''[۹]

☆ ''ہمارے سامنے اس وقت ایک نئے عالمی نظام کی تشکیل کا قیمتی موقع ہے۔ ہمارے لیے بھی اور ہماری آئندہ نسلوں کے لیے بھی۔ ہمیں واقعتاً یہ موقع مل گیا ہے کہ نئے عالمی نظام کی عملی تشکیل کرلیں۔ ایسا نظام جس میں اقوامِ متحدہ بہت زیادہ طاقت کی مالک ہوگی۔ اس کے بانیوں نے مقاصد اپنے پیشِ نظر رکھے تھے وہ وعدہ عملی شکل میں سامنے آئے گا اور اقوامِ متحدہ عالمی امن کو قائم کرنے میں اپنا بنیادی کردار ادا کرسکے گا۔''[۱۰]

☆ ''حکومتوں کے اقتدار کا کیا بنے گا؟ ہم ایک ایسے نازک دور سے گزر رہے ہیں جس میں ایک مکمل بااقتدار ملک کے مرحلہ سے ایک عالمی حکومت کے اقتدار کی طرف منتقلی ہورہی ہے۔''[۱۱]

۶۔ خالد سلیمان فھداوی، ترجمہ: مسعود الرحمٰن خان ندوی، گلوبلائزیشن اور اسلامی تہذیب کی عالمگیریت، ماہنامہ زندگی نو، شمارہ جنوری ۲۰۰۸ء، نئی دہلی)

۷۔ بطروس غالی کی کتاب عالمی حکومت، مطبوعہ ۱۹۹۷ء

۸۔ امریکی خارجہ سیاست کے موضوع پر، راکفلر فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والی کتاب، مطبوعہ ۱۹۵۹ء

۷۔ دستاویز ۷ رپورٹ اور تجزیہ، زیرِ نگرانی: امریکی وزارتِ دفاع، ۲۰ مئی/ مارچ ۱۹۶۲ء

۱۰۔ اقوامِ متحدہ میں جارج بش کی تقریر، ۱۷ جنوری ۱۹۹۱ء

۱۱۔ کتاب 'مغرب کا بحران' تصنیف جیمز وار برگ، مطبوعہ ۱۹۵۹ء

☆ امریکی صدر روز ویلٹ، ہیری ٹرومین، جنرل آئزن ہاور اور جان ایف کینیڈی کے دور سے لے کر امریکی حکومت کا عقیدہ یہ تھا کہ اشتراکی نظام سے جنگ کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ ایسی عالمی اشتراکی حکومت قائم کی جائے جس کی قیادت خود اشتراکی قائدین کریں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عالمی حکومت آہستہ آہستہ پروان چڑھتی رہی اور تدریجی طور پر اقتدار امریکا اور اقوام متحدہ کے حوالے کیا جاتا رہا۔[۱۲]

☆ دنیا کی تمام حکومتوں کو جو اقتدار حاصل ہے، اسے عالمی حکومت کو منتقل کر دینا چاہیے۔[۱۳]

☆ سب سے بہتر عالمی حکومت کے قیام کی شکل یہ ہے کہ ہم اُوپر کے بجائے نیچے سے تعمیر کا کام شروع کر دیں۔ وہ اس طرح کہ تدریجی طور پر تمام ملکوں سے ان کا اقتدار لے کر نئے عالمی نظامِ حکومت کو منتقل کر دیں۔ جنگوں سے بڑھ کر تسلط حاصل کرنے کا سب سے زیادہ مؤثر اور فوری طور پر نتیجہ خیز ہے۔[۱۴]

☆- فضائی آلودگی سے پیدا ہونے والی مشکلات اس دور کا المیہ ہے۔ اس کو حل کرنے کے لیے ہمیں عالمی نظامِ حکومت کی تشکیل کرنا ہوگی۔ اس میں ہوسکتا ہے کہ بعض سخت اور تباہ کن فیصلے کرنے پڑیں، لیکن یہ تو کرنا ہی ہوگا۔[۱۵]

☆ حکومتوں کے غیر ذمہ دارانہ تصرفات پر پابندی ضروری ہے، اور یہ کام بغیر عالمی نظامِ حکومت کے قیام کے ممکن نہیں۔ جس طرح بین الاقوامی عدالت حکومتوں کا محاسبہ کرتی ہے، اسی طرح ہم تمام ملکوں کو ایک دائرہ میں لانا چاہتے ہیں۔[۱۶]

☆ ملکی اقتدار، وطن پرستی اور بالادستی کے مفہوم میں تبدیلی آتی رہی ہے۔ تنگ اور محدود تر ملکی اقتدار، پرامن بقائے باہمی کی زندگی کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوسکتا ہے۔ اس لیے ملکوں کو ایک دوسرے پر اعتماد کرنا ہوگا اور انھیں اپنی سرحدوں کی نشانی مٹانی ہوگی۔[۱۷]

☆ اقوام متحدہ کو اپنے چارٹر میں تبدیلی کرنی چاہیے یعنی ممبر ملکوں کے داخلی معاملات میں مداخلت ناگزیر ہوگئی ہے اس لیے کہ یہ تمام ممالک انسانی حقوق کی کھل کر خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ وہ دلیل یہ دیتے ہیں کہ یہ ہمارا اندرونی معاملہ ہے۔ مہذب انسانی سوسائٹی اب مزید اس خلاف ورزی کو برداشت نہیں کرسکتی۔[۱۸]

☆ بہت آہستہ آہستہ دور رس تبدیلیاں ہورہی ہیں۔ ملکوں کے اقتدارِ اعلیٰ تدریجی طور پر ان کے ہاتھوں سے نکلتے جارہے ہیں۔ یوگوسلاویہ کی خانہ جنگی نے ہمیں یہ موقع فراہم کیا ہے۔[۱۹]

۱۲- ایڈتھ روز فیلٹ (امریکی صدر روز ویلٹ کی پوتی) کا بیان، ۲۳ دسمبر ۱۹۹۶ء

۱۳- امریکی وزارتِ دفاع کی تجزیاتی رپورٹ دستاویز ۷ سے: ۲۰ مارچ ۱۹۶۲ء

۱۴- رسالہ فارن افیئرز، شمارہ اپریل ۱۹۷۴ء، مقالہ نگار رچرڈ گارڈنر، (مقالہ نگار کینیڈی اور جانسن کے دور میں امریکی وزیرخارجہ کے معاون تھے)

۱۵- میخائل گورباچوف، جنوری ۱۹۹۰ء　　۱۶- نیویارک ٹائمز، ۱۴/اگست ۱۹۹۱ء

۱۷- بطروس غالی کا سلامتی کونسل سے خطاب، ۳۱ جنوری ۱۹۹۳ء

۱۸- جارج بش کی صدارت میں ۲۰ ملکوں کے سربراہوں کی طرف سے جاری کردہ مشترکہ بیان، یہ بیان اقوام متحدہ سے جاری کیا گیا۔ ۲/اپریل ۱۹۹۳ء

۱۹- اداریہ روزنامہ لاس اینجلز ٹائمز، ۳ مئی ۱۹۹۳ء

فوجی قوت کی نوعیت

☆ دوسرے مرحلہ میں تدریجی طور پر اقوام متحدہ کی بین الاقوامی فوج کی تشکیل کی جائے گی۔ تیسرے مرحلہ میں منظّم طور پر بڑی سرعت سے تمام ملکوں کو جوہری اسلحوں سے محروم کردیا جائے گا۔ اس طرح کسی بھی ملک کے لیے یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہ اقوام متحدہ کی طاقتور فوج کو چیلنج کرسکے۔۲۰

☆ تمام ملکوں کو طاقتور ہتھیاروں سے محروم کردینے کا خواب، ہوسکتا ہے حقیقت بن جائے۔۲۱

☆ سلامتی کونسل کے ماتحت ایک دائمی بین الاقوامی فوج کی تشکیل سے اقوام متحدہ کو ایسی زبردست قوت حاصل ہوجائے گی کہ اس سے اس کی ہیبت میں اضافہ ہوجائے گا۔ اس فوج کو عالمی پولیس کی حیثیت حاصل ہوگی، جس کے ذریعہ سلامتی کونسل اپنے عزائم اور پروگراموں کو دوسروں پر مسلط کرسکے گی۔۲۲

نئے عالمی نظام کی تشکیل میں امریکا کا کردار

عالمگیریت کی تشکیل میں امریکا کا کیا کردار ہے؟ اس کا جواب دینے کے لیے خود امریکی رہنماؤں کے بیانات ملاحظہ کیجیے۔

☆ ہمارے درمیان نئے عالمی نظام کی داغ بیل ڈالی جارہی ہے، اس میں ہمارے ملک (امریکا) کا خاص رول ہے۔۲۳

☆ امریکی صدر کے مشیر کرنل ایڈورڈ منڈیل ہاؤس کو جس چیز نے مجبور کیا کہ وہ امریکا کو پہلی عالمی جنگ میں گھسیٹ لے جائیں، وہ ان کی یہ توقع تھی کہ اس طرح نئے عالمی نظام کی تشکیل آسانی سے ہوجائے گی۔۲۴

☆ نیا عالمی نظام گیارہ سال کے اندر وجود میں آجائے گا۔ ہم نے اس کے لیے کیا تیاریاں کی ہیں؟۲۵

☆ ۲۰۰۰ء کا آغاز دراصل نئے ہزار سال کی تاریخ میں انقلابی موڑ ہوگا۔۲۶

امریکی حکمت عملی

ہر دور میں جنگ، جنگ کا اسلوب اور جنگی ہتھیار بدلتے رہے ہیں اور نئے نئے ہتھیار اسلحہ خانے کی زینت اور انسانیت کے لیے مصیبت بنتے رہے ہیں۔ جنگِ عظیم دوم کے اختتام پر اگست ۱۹۴۵ء میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر امریکا کے ایٹمی حملے نے اجتماعی تباہی کے ہتھیار Weapon of Mass Destruction (WMD) کی اصطلاح کو عالمی سیاست اور جنگ وصلح کی لغت میں ایک خاص مقام دے دیا۔ کیمیاوی، حیاتیاتی اور گیس پر مبنی اسلحے کے لیے یہ لفظ اس سے پہلے بھی استعمال ہوتا تھا لیکن دورِ جدید میں ڈبلیو ایم ڈیز نے بڑی اہمیت اختیار کرلی ہے۔

۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد 'دہشت گردی' اور 'خودکش حملوں' کو بھی ایک قسم کا ڈبلیو ایم ڈی ہی بناکر پیش کیا جارہا ہے اور

۲۰- امریکی وزارت خارجہ کا مطبوعہ بلیٹن ۷۲۷۷، ستمبر ۱۹۶۱ء

۲۱- اداریہ روزنامہ لاس انجلز ٹائمز، ۵ جنوری ۱۹۹۳ء، مقالہ نگار: بیرڈ اور جی بیروٹیز

۲۲- مقالہ نگار: نارمن کیمبسٹر، روزنامہ لاس انجلز ٹائمز، ۲ فروری ۱۹۹۲ء

۲۳- امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر، ۱۸/اپریل ۱۹۷۵ء

۲۴- امریکن اوپنین، ص ۶۱، شمارہ جنوری ۱۹۷۲ء

۲۵- اقوام متحدہ میں جارج بش کی تقریر، ۱۶ مارچ ۱۹۸۹ء

۲۶- اقوام متحدہ میں بش کی تقریر، ۱۱/اکتوبر ۱۹۹۰ء

دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر امریکا نے دنیا کو نہ صرف دہشت گردی کے ایک بدترین عفریت کی آماجگاہ بنا دیا ہے، بلکہ اس نام نہاد جنگ کے پردے میں کچھ دوسری ہی قسم کے اجتماعی تباہی کے ہتھیاروں سے دنیا کے مختلف ممالک اور تہذیبوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔

امریکا کی اس حکمت عملی کی یہ جھلکیاں اس کے اعلیٰ سطح کے عہدیداران کے بیانات میں تو دیکھی جاسکتی ہیں لیکن اس کا واضح اور مکمل اظہار کچھ عرصے قبل شائع ہونے والی ایک اہم رپورٹ میں ہوتا ہے جس میں جنگ کا پورا نقشہ دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ رپورٹ وہاں کے مشہور تھنک ٹینک رینڈ کارپوریشن کے قومی سلامتی کے تحقیقی شعبے نے تیار کی ہے اور Civil Democratic Islam; Partners, Resources and Strategies کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ اسے Cheryl Benard نے مرتب کیا ہے۔ اس کی تیاری میں آٹھ دوسرے دانش وروں نے بھی شرکت کی ہے جس میں افغانستان میں سابق امریکی سفیر زلمے خلیل زاد بھی شریک ہیں۔

مسلمانوں کی چار طبقات میں تقسیم

رپورٹ کا بنیادی تصور یہ ہے کہ آج اسلام ایک دھماکہ خیز شکل اختیار کر گیا ہے جو اندرونی اور بیرونی جدوجہد میں مصروف ہے، تاکہ اپنے اقتدار اور اپنے تشخص کو اُبھار سکے اور ان کی روشنی میں دنیا میں اپنا مقام حاصل کر سکے۔ اس پس منظر میں امریکا اور مغربی دنیا کا مفاد اور ہدف یہ ہونا چاہیے کہ اسلامی دنیا ایک ایسی صورت اختیار کرے جو مغرب کے ساتھ ہم آہنگ ہو، یعنی جمہوری اس معنی میں کہ سماجی اعتبار سے ترقی پسند (Socially Progressive) ہو اور بین الاقوامی طور پر قابلِ قبول رویہ اختیار کرے۔ اس کے لیے امریکی پالیسی کیا ہو؟

رپورٹ کہتی ہے: اس لیے دانش مندی کی بات یہ ہے کہ اسلامی دنیا میں ان عناصر کی حوصلہ افزائی کی جائے جو عالمی امن اور عالمی برادری سے ہم آہنگ ہیں اور جمہوریت اور جدیدیت کو پسند کرتے ہیں۔ اس رپورٹ میں مسلمانوں کو چار بڑے بڑے زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱- بنیاد پرست (Fundamentalists) جو مغربی تہذیب کے خلاف ہیں اور اسلامی قانون اور اخلاقیات کا وہ تصور رکھتے ہیں جو رپورٹ کے مصنّفین کی نگاہ میں جدیدیت سے متصادم ہے۔ یہ مغرب کے لیے سب سے بڑا خطرہ اور نتیجتاً اہم ترین دشمن ہیں۔

۲- دوسرا گروہ قدامت پسندوں (Traditionalists) کا ہے جو تبدیلی، تجدد اور جدیدیت سے خائف ہیں اور روایت کے اسیر رہنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ یہ بھی ہمارے دشمن ہیں مگر نمبر ایک کے مقابلے میں غنیمت ہیں۔

۳- تیسرا گروہ جدیدیت پسندوں (Modernisits) کا ہے جو اسلامی دنیا کو آج کی مغربی دنیا (جسے رپورٹ عالمی برادری Global Community قرار دیتی ہے) سے ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے اسلام کو جدید بنانے کے خواہاں ہیں۔ یہ ہمارے لیے قابلِ قبول ہیں باوجود اس کے، کہ یہ گروہ اسلام سے رشتہ باقی رکھنا چاہتا ہے۔

۴- چوتھا گروہ جو مغرب کے لیے سب سے زیادہ پسندیدہ ہے وہ لادینیوں (Secularists) کا ہے جو دین و دنیا اور مذہب اور سیاست کی علیحدگی کے کھلے کھلے قائل ہیں اور مغرب کے ماحول کی مکمل پیروی کرتے ہوئے مذہب کو

ذاتی مسئلے اور اجتماعی امور کو مغربی صنعتی جمہوریتوں کے طور طریق پر چلانا چاہتے ہیں۔

دراصل رپورٹ میں ان چاروں کے درمیان بھی تقسیم در تقسیم کی نشان دہی کی گئی ہے جن میں سب سے 'فسادی' اور خطرناک وہ بنیاد پرست ہیں جو ان کی نگاہ میں تشدد کے طریقے اختیار کرتے ہیں۔ تمام بنیاد پرست دہشت گرد نہیں خطرناک ضرور ہیں۔ اسی طرح قدامت پسندوں، جدیدیت پسندوں اور لادینیوں میں بھی کم از کم دو دو گروہ ہیں۔

حکمت عملی کے اہم نکات

اس رپورٹ کے مصنّفین نے مقابلے کے لیے جو بنیادی حکمت عملی پیش کی ہے اس کے سلسلے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ طرزِ فکر ترقی، جدیدیت اور تہذیب یافتہ جمہوری اسلام کی تشکیل کو مضبوط کرنا اور فروغ دینا چاہتا ہے۔ یہ مختلف حالات سے ان کی مناسبت سے نمٹنے کے لیے ضروری لچک فراہم کرتا ہے اور غیر مطلوب (Unintended) منفی خطرات کے اثرات کو کم کرتا ہے۔ درج ذیل خاکے سے واضح ہوتا ہے کہ ایسی حکمت عملی کیا ہوگی؟

☆- پہلے قدم پر جدیدیت پسندوں کی حمایت کی جائے، انھیں اپنے نظریات مرتب کرنے اور پھیلانے کے لیے وسیع پلیٹ فارم فراہم کرکے، ان کے تصورِ اسلام کو روایت پسندوں کے تصور کے مقابلے میں زیادہ وقعت دے کر، روایت پسندوں کے بجائے انھی کو معاصر اسلام کے حقیقی نمائندے کے طور پر تیار کیا جائے اور عوامی سطح پر پیش کیا جائے۔[۲۷]

☆ لادینیت پسند عناصر میں سے ہر ایک کی اس کی کیفیت اور ضرورت کی مناسبت (Case by Case) سے حمایت کی جائے۔

☆ لادینی، تہذیبی اور ثقافتی اداروں اور پروگراموں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

☆ روایت پسندوں کی اس حد تک پشت پناہی کی جائے جو انھیں بنیاد پرستوں کے مقابلے کے قابل رکھے۔ (اگر اور جہاں، یہ ہمارا انتخاب ہو) اور دونوں گروہوں کے درمیان قریبی اتحاد روکا جائے۔ روایت پسندوں کے اندر ہمیں انتخاب کر کے ایسے عناصر کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے جو جدید سول سوسائٹی سے نسبتاً بہتر مناسبت رکھتے ہوں۔ مثال کے طور پر بعض اسلامی فقہی مکاتب ہمارے انصاف اور انسانی حقوق کے تصور سے بہ نسبت دوسروں کے زیادہ قریب ہیں۔

☆ آخری بات یہ کہ بنیاد پرستوں کے اسلامی اور نظریاتی موقف میں کمزور مقامات پر پوری قوت سے حملہ کیا جائے تاکہ وہ باتیں کھل کر سامنے آئیں جو ان کے مخاطب لوگوں میں سے نوجوان مثالیت پسند اور نیکوکار روایت پسند ٹھیک نہ سمجھیں۔ ان کی بدعنوانی، ان کی بے رحمی، ان کی جہالت، اسلام کے اطلاق میں ان کا تعصب اور واضح غلطیاں اور قیادت کرنے اور حکومت کرنے کی ان کی نااہلیت۔[۲۸]

---

۲۷ Cheryl Benard, Civil Democratic Islam; Partners, Resources and Strategies. The Report of Rend Corpration. USA. Page 47-48

۲۸ Cheryl Benard, Civil Democratic Islam; Partners, Resources and Strategies. The Report of Rend Corpration. USA. Page 47-48۔۲۰

رپورٹ کی مزید تفصیلات کے لیے جائیں: www.rand.org

براہِ راست سرگرمیاں

اس مجموعی طرزِ فکر کی تقویت کے لیے کچھ اضافی براہِ راست سرگرمیاں ضروری ہوں گی جیسی کہ ذیل میں درج ہیں:

☆ اسلام کی تعریف، تشریح اور تعبیر کرنے پر بنیادوں پرستوں اور روایت پسندوں کے اجارے کو توڑنے میں مدد دی جائے۔

☆ ایسے مناسب جدیدیت پسند علما کی شناخت کرنا جو ایسی ویب سائٹس چلائیں جن میں روزمرہ کے معاملات کے بارے میں سوالات کے جواب دیے جائیں اور جدید اسلامی فقہی آرا پیش کی جائیں۔

☆ نصابات کی تشکیل اور درسی کتب لکھنے کے لیے جدیدیت پسند اسکالروں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

☆ زرِتلافی شامل کر کے کم قیمت پر تعارفی کتب کی اشاعت کی جائے اور انھیں اسی طرح دستیاب کیا جائے جس طرح بنیاد پرست مصنفوں کے کتابچے دستیاب ہیں۔

☆ مقبول عوامی ذرائع ابلاغ، جیسے ریڈیو کو استعمال کر کے جدیدیت پسند مسلمانوں کی فکر اور عمل کو عام کیا جائے تاکہ اسلام کا جو مطلب ہے اور جو مطلب ہوسکتا ہے اس کا عالمی دائرہ وسیع تر ہو۔

اس حکمت عملی کے بنیادی نکات یہ بیان کیے گئے ہیں:

۱- قائدین اور رول ماڈل تیار کرنا۔ وہ جدیدیت پسند جن کے ستائے جانے کا اندیشہ ہے ان کو شہری حقوق کے حوصلہ مند قائدین کے طور پر سامنے لایا جائے جو وہ فی الحقیقت ہیں۔ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ یہ مفید مطلب ہے۔

۲- سیاسی حد رسائی (Out Reach) کے معاملات میں جدیدیت پسند عام مسلمانوں کو شامل کیا جائے تاکہ آبادی کی بنیاد پر حقیقی صورت حال کی صحیح عکاسی ہو۔ مسلمانوں کی اسلامیت کو مصنوعی طور پر اُبھارنے سے احتراز کیا جائے۔ اس کی بجائے ان کو اس بات کا عادی بنایا جائے کہ اسلام ان کی شناخت کا ایک حصہ ہوسکتا ہے۔

۳- اسلامی دنیا میں سول سوسائٹی کی حمایت کی جائے۔ یہ بحرانی حالات میں مہاجروں کی دیکھ بھال میں اور تنازعے کے بعد کی صورت حال میں خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے۔ اس صورت میں ایک جمہوری قیادت سامنے آسکتی ہے۔ دیہی اور پڑوسی کی سطح پر بھی یہ انجمنیں ایک ایسا انفراسٹرکچر ہیں جو سیاسی شعور بیدار کرسکتی ہیں اور معتدل جدیدیت پسند قیادت اُبھار سکتی ہیں۔

۴- مغربی اسلام، جرمن اسلام اور امریکی اسلام وغیرہ کو تشکیل دینا۔ اس کے لیے ان معاشروں کی ہیئت کا اور ان کے ہاں رائج فکر وعمل کے ارتقا کا بہتر فہم حاصل کرنے کی ضرورت ہوگی۔ ان کے نظریات کا استنباط کرنے، اظہار کرنے اور ان کو قانونی شکل دینے (Codifying) میں مدد دی جائے۔

۵- انتہا پسند اسلام سے وابستہ افراد اور موقفوں کو بے جواز قرار دیا جائے۔ بنیاد پرست خودساختہ قائدین کے غیر اخلاقی اور منافقانہ افعال کو عام کیا جائے۔ مغرب پر اخلاقی اور سطحیت کے الزامات، بنیاد پرستوں کے اسلحہ خانے کا پُرکشش حصہ ہیں، جب کہ انھی نکات پر وہ خود بہت زیادہ حملے کی زد میں ہیں۔

۶- عوامی ذرائع ابلاغ میں عرب صحافیوں کی حوصلہ افزائی کرنا کہ وہ بنیاد پرست قائدین کی زندگیوں، عادات و اطوار

اور بدعنوانیوں پر تفتیشی رپورٹنگ کریں۔ ان واقعات کی تشہیر کی جائے جو ان کی بے رحمی کو ظاہر کرتی ہے، مثلاً حال منافقت جس کا اظہار اس سے ہوتا ہے کہ سعودی مذہبی انتظامیہ تارکِ وطن کارکنوں کو اپنے نئے پیدا ہونے والے بچوں کی تصویریں منگوانے سے اس بنیاد پر روکتی ہے کہ اسلام میں تصویر بنانا منع ہے، جب کہ ان کے اپنے دفاتر میں شاہ فیصل کی بڑی بڑی تصاویر آویزاں ہیں۔

۷- دینی سرگرمیوں کی مالی معاونت کے نظام کو درہم برہم کیا جائے، اس لیے کہ دہشت گردی اور انتہاپسندی کو وسائل فراہم کرنے میں خیراتی اداروں کا کردار ۱۱ستمبر کے بعد زیادہ واضح طور پر سمجھا جا رہا ہے۔ ضروری ہوگیا ہے کہ سرکاری سطح پر تحقیقات ہوں اور مسلسل جاری رہیں۔

۸- خوش حال و معتدل اسلام کے نمونے کے طور پر مناسب نظریات رکھنے والے ممالک اور علاقوں یا گروپوں کی شناخت کرکے اور ان کی سرگرمی سے مدد کرکے تشہیر کی جائے۔ ان کی کامیابیوں کو شہرت دی جائے۔

۹- تصوف کے مقام و مرتبے کو بلند کیا جائے۔ مضبوط صوفی روایات کے حامل ممالک کی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ وہ اپنی تاریخ کے اس حصے کی اہمیت کو سمجھیں اور اسے اپنے اسکول کے نصاب میں شامل کریں۔ صوفی اسلام پر زیادہ توجہ دی جائے۔

۱۰- انقلابی اسلامی تحریکوں کے بڑی عمر کے وابستگان کے نظریات تبدیل ہونے کی آسانی سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ لیکن اگر جمہوری اسلام کا پیغام متعلقہ ممالک کے اسکول نصابات میں اور سرکاری میڈیا میں داخل کردیا جائے تو ان کی نوخیز نسل پر اثرانداز ہوا جاسکتا ہے۔ انقلابی بنیاد پرستوں نے تعلیم میں رسوخ حاصل کرنے کے لیے بہت کوششیں کی ہیں اور اس کا امکان بہت کم ہے کہ وہ کسی لڑائی کے بغیر اپنی قائم شدہ جڑیں چھوڑ دیں۔ یہ میدان ان سے واپس حاصل کرنے کے لیے ایک بھرپور کوشش کی ضرورت ہوگی۔

اس بھرپور تہذیبی، فکری اور تعلیمی جنگ کا پورا نقشہ آپ کے سامنے ہے۔ اگر اب بھی کسی کو امریکی سامراج کی تازہ ترین صلیبی جنگ کے اصل اہداف، مقاصد اور مضمرات کو سمجھنے میں مشکل پیش ہے تو اس کی وجہ امریکی دانشوروں کی صاف گوئی کی کمی نہیں، اپنی کج فہمی اور تغافل جاہلانہ ہوسکتی ہے۔ رہے ہمارے حکمران اور لبرل دانش ور، تو ذرا امریکا بہادر کے ان ارشادات کا موازنہ اپنے حکمرانوں، وزراء بلکہ کچھ 'علمائے کرام' کی گوہرافشانیوں سے کرکے دیکھ لیجیے کہ اس رپورٹ میں کتنی حقیقت ہے اور کتنا افسانہ۔[۲۹]

نیوورلڈ آرڈر کے ارتقائی مراحل

پہلے امریکی سپریم کورٹ چیف جسٹس جان جے نے کہا تھا کہ ''جو ملک کو اون (own) کرتا ہے اسے ہی حکومت کرنی چاہیے''۔ بات وہی ہے لیکن امریکیوں نے اس کو وسعت دے کر پوری دنیا تک پھیلا دیا ہے۔ ''اس دنیا پر وہی حکمرانی کرے گا جو اس کو اون کرے گا''۔ اب دنیا کو سب سے بہتر اون کون کرتا ہے تو اس کا علم تو سب کو ہے یعنی امریکا اور اس کے یورپی حواری۔

تو یہ کہانی اگرچہ ۱۹۷۳ء سے شروع ہوتی ہے، مگر امریکا ۱۹۲۰ء سے اس منصوبہ بندی میں لگا ہوا ہے کہ مشرق وسطیٰ کے تیل کے ذخائر پر مہذبانہ طریقے سے قابض ہوجائے۔ بات ایک سہ فریقی کمیشن کے قیام سے شروع ہوتی ہے جو ڈیوڈ

۲۹- اس مضمون کی تیاری کے لیے پروفیسر خورشید احمد کے مضمون شائع شدہ ترجمان القرآن، جون ۲۰۰۴ء سے مدد لی گئی ہے۔

راک فیلر نے بنایا تھا اس کا مقصد عالمی معاشی و مالیاتی ترجیحات کو دنیا کے تین بڑی مارکیٹس یعنی امریکا، یورپ اور جاپان کی خواہشات کے گرد ترتیب دینا تھا۔

یہ کمیشن ایک واضح ہدف رکھتا تھا۔ دنیا میں اُبھرتی ہوئی معاشی قوتوں کے لیے امریکی، یورپی اور جاپانی ترجیحات کے مطابق عالمی قوانین اور اصول وضوابط کو ترتیب دینا تھا، تاکہ کسی کو بھی 'بے لگام' نہ ہونے دیا جائے اور اس میں بھی یورپ اور جاپان تو بظاہر امریکا کے 'حلیف' ہیں لیکن اصل آقا تو امریکا ہے جہاں کی دونوں بڑی سیاسی پارٹیوں کی تمنا ایک عالمی امریکی ایمپائر کی تعمیر ہے جسے وہاں کے لوگ پاکس امریکانا (Pax Americana) یا امریکی مفادات کی بھٹی سے نکلا ہوا امن کہتے ہیں جسے وہ دنیا بھر میں چاہتا ہے۔

اس کے کچھ بنیادی اجزاء یہ ہیں: ایک وسیع وعریض عسکری قوت، دنیا کے مالیات پر جہاں تک ممکن ہوسکے، کنٹرول حاصل کرنا، اپنی فوج کو ان علاقوں تک بھیجنا جہاں ہمارے بادشاہ گروں کے مفادات پوشیدہ ہیں، شہریوں کو بے اختیار کرنا، چاہے اپنے ہی ملک میں یا دنیا میں، پروپیگنڈا، غلط معلومات کا تیز بہاؤ اور انسانی حقوق پر قدغنیں لگانا پڑیں، معاشی نظام کو ایسے سانچے میں ڈھال لینا کہ جہاں اُوپر سے نیچے تک پلوٹوکریسی (سوسائٹی پر دولت مند طبقے کی حکمرانی) ہو۔

اس کہانی کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ پرانے لفظوں کو نئی تعریف دے دی گئی، مثلاً: 'جمہوریت اور آزادی'____ ان کا کوئی تعلق انفرادی حقوق سے نہیں یا اکثریت کو آزادی نہیں مل سکتی کہ وہ اپنی پسند کے حکمران منتخب کرسکیں تاکہ کچھ ان کے حقوق کا تحفظ بھی ہوسکے۔ یہاں 'جمہوریت اور آزادی' سے مراد بڑی کارپوریشنوں کی آزادی ہے۔ وہ بھی دنیا بھر میں اپنے منتخب کردہ ملک میں____ پھر ایسے حکمران بھی چننے پڑتے ہیں جو اس ایمپائر کی رکھوالی کرسکیں۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ جمہوری طریقے سے آئے ہوں یا غیرجمہوری طریقے سے____ دوسرے لفظوں میں ایسی کٹھ پتلیاں درکار ہیں جو امریکی پالیسیاں ترتیب دینے والوں کے مفادات کا پوری جانفشانی سے خیال رکھ سکیں۔

اس تمام کہانی کو ہی ہمارے 'اصل' حکمران نیوورلڈ آرڈر کہتے ہیں جس کو سب سے پہلے بش سینئر نے ۱۱رستمبر ۱۹۹۰ء کو اپنی ایک تقریر میں ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کیا تھا۔ دھیان دیجیے تاریخ کیا تھی؟ ۱۱رستمبر۔ کیا یہ کوئی اتفاق تھا یا ایک طویل المدتی منصوبے کا یک حصہ؟ لیکن مسئلہ اس نیوورلڈ آڈر پر عمل درآمد کا تھا۔ اس میں پہلی بڑی رکاوٹ، سوویت یونین تھا جس کے ٹکڑے ۱۹۸۹ء ہوگئے جس کے بعد امریکا کے علاوہ دنیا میں کوئی دوسری بڑی سپر پاور موجود نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی امریکا کو یورپ اور جاپان کی مدد کی ضرورت بھی نہ رہی۔

دوسرا مسئلہ اس ورلڈ آرڈر کے لیے ایک خطیر سرمایہ کی فراہمی تھا، جس کے لیے لازمی تھا کہ امریکی حکومت، تعلیم، سوشل سروسز، ترقیاتی بجٹ میں سے کٹوتی کرے، جس کے لیے لازم تھا عوام کو اس بارے میں پہلے سے تیار کیا جاتا، لیکن عوام اپنے دیے ہوئے ٹیکسوں میں سے اس طرح کی معرکہ آرائی کی کیوں اجازت دیتے جس سے خود ان کو سہولیات سے دستبردار ہونا پڑتا جس کے لیے وہ کبھی تیار نہیں ہوتے، ساتھ ہی ساتھ امریکی قوم میں ایک ایسا ولولہ پیدا کرنا جس کے ذریعے سے اس طویل المدت منصوبہ پر بحسن وخوبی عمل کیا جاسکے۔

یہ تھا بنیادی مسئلہ جس کے لیے امریکی حکومت کے لیے لازم تھا، کہ کچھ ایسے اقدامات کیے جاتے جو کہ نہ صرف

عوام کو اس معرکہ آرائی کے لیے تیار کرتے بلکہ انفرادی آزادی جیسے حق کو بھی محدود کرنے پر رضامند ہوجاتے تاکہ امریکا کے اندر پایا جانے والا انسانی حقوق کے حوالے سے کوئی تنقید نہ کرسکے کہ اپنے ملک میں تو انسانی حقوق کا اتنا احترام اور باہر کی دنیا میں انسانی حقوق کی اس قدر پامالی۔

اس قسم کی پریشانی امریکا پہلے بھی دیکھ چکا تھا کہ جنگِ عظیم دوم نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا لیکن عوام کے بے پناہ دباؤ کی وجہ سے امریکی حکومت براہِ راست اس جنگ میں کود پا رہی تھی۔ اس حوالے سے خود کچھ امریکی حلقوں کا کہنا ہے کہ امریکی صدر نے کانگریس اور عوام کو جنگِ عظیم کے حوالے سے راضی کرنے کے لیے 'پرل ہاربر' پر جاپانی حملے کو یقینی بنانے کے لیے اقدامات کیے جس کے تحت امریکی جہاز کو ایک جگہ پر لنگر انداز کیا گیا جہاں پر جاپانی ایئر فورس کے جہاز آسانی سے پرل ہاربر کو نشانہ بنا سکیں۔ ساتھ ہی ساتھ حملے سے متعلق معلومات کی ترسیل کو بھی رکوانے کے اقدامات کیے۔۳۰

اس تمام منصوبہ بندی کا نتیجہ پرل ہاربر کی تباہی عمل میں آئی اور ایک اندازے کے مطابق ۲۴ سو امریکی فوجی ہلاک ہوئے لیکن بظاہر امریکی حکومت اپنے مقصد میں یعنی جنگِ عظیم میں عملی طور پر شریک ہونے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

اب وہی مسئلہ دوبارہ سے امریکی حکومت کو درپیش تھا، نیو ورلڈ آرڈر کی تکمیل کے لیے لازمی تھا کہ کوئی ایسا حادثہ یا ایونٹ تخلیق کیا جاتا جس کے بل بوتے پر امریکی حکومت اپنے ایجنڈے کی تکمیل میں کانگریس اور عوام کو اپنے ساتھ ملا سکے۔ اس کے لیے ۱۱ رستمبر ۲۰۰۱ء کا واقعہ تخلیق کیا جاتا ہے (جبکہ ٹھیک ۱۱ سال پہلے بش سینئر نے ۱۱ ستمبر ۱۹۹۰ء) کو اپنی ایک تقریر میں نیو ورلڈ آرڈر کی اصطلاح استعمال کی تھی) جس میں ۴۰۰۰ سے زائد امریکی ہلاک ہوجاتے ہیں، اس واقعہ کو بنیاد بنا کر امریکا پہلے افغانستان میں اور پھر عراق میں فوج کشی کرتا ہے، تاکہ ان بڑی کارپوریشنز کے مفادات کو محفوظ کیا جاسکے جنھوں نے عراق (یعنی مشرق وسطیٰ) اور افغانستان (یعنی وسطی ایشیا) اور جس کے لیے انھوں نے برسوں پہلے سے خاکہ ۳۱ تیار کر رکھا تھا۔۳۲

اس حوالے سے معروف امریکی مصنف جان پرکنز کی کتاب 'اقتصادی غارت گر' نہایت چشم کشا ہے جس میں نہایت تفصیل کے ساتھ اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ امریکا نے کیوں عراق پر حملہ کیا؟ اس کے متعلق جان پرکنز نے جملہ استعمال کیا ہے کہ "آج یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ جس کا کنٹرول عراق پر ہوگا، وہی پورے مشرق وسطیٰ کو کنٹرول کرے گا"۔

اسی طرح افغانستان میں امریکا کو طالبان حکومت کے ساتھ کوئی مسئلہ ہو نہ ہو لیکن وسطی ایشیا سے گیس کی ترسیل اور اس کی آزادانہ فراہمی امریکا کے لیے یقیناً اہم تھی جس کے لیے سینٹ گیس (سینٹرل ایشیا گیس پائپ لائن) کے نام سے ایک کنسورشیم امریکی آئل کمپنی یونوکال نے بنایا تھا جس کے تحت ملٹی بلین ڈالر پراجیکٹ کو مشرق وسطیٰ سے شروع ہوکر،

---

۳۰ The Grand Chessboard: American Primacy and Its Geostrategic Imperative (New York: Basic Books, 1997, Former National Security Advisor Zbigniew Brezezinski.

۳۱ David Ray Griffin (pp 130-131 of The 9/11 Commission Report: Omisions and Distortions).122-123 of the 9/11 Commission Report, Griffin.

۳۲ Rebuilding America's Defenses, published by Project for the New American Century (PNAC) in September 2000

افغانستان سے ہوتے ہوئے پاکستان کے سمندروں تک پہنچنا تھا۔۳۳؎

لیکن طالبان حکومت کی طرف سے پیش کی جانے والی شرائط کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ اب افغانستان پر حملہ کیا جائے گا اور اس کے لیے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کا منصوبہ بنایا گیا اور پھر اس میں اکتوبر ۲۰۰۱ء کے مہینہ میں رنگ بھرنے کا فیصلہ کیا گیا۔۳۴؎ اور اس کے بعد کا نتیجہ سب کے سامنے ہے۔

یہ تھی اس نیو ورلڈ آرڈر کی کہانی جس کے لیے امریکا نے پوری دنیا کو داؤ پر لگانے کا فیصلہ کیا اور پھر اس پر کامیابی کے ساتھ عمل درآمد بھی شروع کر دیا۔ ہاں بس مسلم دنیا ہی اپنے اختلافات کو بھلا کر اس کا مقابلہ کرنے پر تیار نہیں نظر آتی اور امریکن ورلڈ آرڈر کو پورا کرنے میں اپنا کردار بالکل اسی طرح ہی ادا کر رہی ہے جس طرح سے امریکی منصوبہ سازوں نے اس کا کردار طے کیا ہے۔۳۵؎

گلوبلائزیشن اور امید کی کرن

ذرائع ابلاغ گلوبلائزیشن کا سب سے مؤثر ہتھیار ہے جس کے ذریعے دنیا ایک آنگن بن چکی ہے۔ ایک طرح کی خوراک، ایک ہی لباس اور ایک ہی طرزِ معاشرت یہی استعمار کی خواہش ہے۔ اِس گلوبلائزیشن کی وجہ سے ہماری معاشرتی اقدار اور خاندان کا ادارہ سخت خطرے سے دوچار ہیں۔ مگر ایک خوش آئند بات یہ ہے کہ شفافیت کا دور بھی اُتنا ہی قریب آرہا ہے، ہر راز آشکار ہو رہا ہے۔ حقیقت کا حسن پوری طرح جلوہ گر ہونے میں اگرچہ کچھ رات باقی ہے مگر یوں لگتا ہے کہ سحر قریب ہے۔ میں نے اپنے اِس مقالے کے سلسلے میں بیرونِ ملک اداروں خاص طور پر امریکی یونیورسٹیز کا رویہ دیکھا ہے کہ وہ بہت زیادہ تعاون کرتے ہیں اور معلومات کے تبادلے میں بہت زیادہ فراخ دلانہ رویہ رکھتے ہیں۔ وہ لوگ خاندان اور شادی کے اداروں کے لیے بہت زیادہ فکرمند ہیں کیونکہ یہ ادارے وہاں پر ختم ہوتے جا رہے ہیں لہٰذا وہ اِس کے لیے تحقیق میں بہت زیادہ معاونت کرتے ہیں۔ دنیا اُمید پر قائم ہے اور ان شاء اللہ ہمیں اس دنیا میں اعلیٰ انسانی اقدار کی ترویج کے لیے گلوبلائزیشن کے مثبت پہلوؤں کو بروئے کار لانے کا عزم کرنا چاہیے۔

۳۳؎ from George Arney, "U.S Planned Attack on Taleban", BBC News, September 18, 2001, as reported by Griffin, p 316.

۳۴۔ خالد سلیمان فہداوی، گلوبلائزیشن اور اسلامی تہذیب کی عالمگیریت، ماہنامہ زندگی نو، شمارہ جنوری ۲۰۰۸ء، نئی دہلی

۳۵؎ (اس مضمون کی تیاری میں معروف امریکی مصنف ڈیوڈسن لوہر (Davidson Loehr) کے مضمون New World Order Story سے استفادہ کیا گیا ہے)۔ www.informationiclearinghouse.com